اور وہ ہیں تمام عرب۔ اس کارنامے کے لیے جس طرح مومنین کی ضرورت تھی اسی طرح مشرکین عرب کی بھی ضرورت تھی۔ بظاہر اسلام سے جن لوگوں نے محاربہ کیا ہے دراصل انہوں نے اس کارنامے کو کامیاب کرنے میں اتنا ہی حصہ لیا ہے جتنا اُس کے حامیوں اور مددگاروں نے لیا۔ ۔ ۔ لہٰذا اسلام ایک عرب قومیت کی تحریک تھی۔ اس کا مقصد عرب قومیت (عروبہ) کی تجدید و تکمیل تھی۔ چنانچہ اسلام کی زبان عربی ہے، اور حالات کے بارے میں اسلام کا مطالعہ عربی ذہن کی عینک سے تھا۔ اسلام نے جن فضائل اور اوصاف کو بیان کیا ہے وہ سب عربوں کے فضائل اور اوصاف تھے۔ جس طرح ہم آج بعض افراد کو "وطن پرست" اور "قوم پرست" کہتے ہیں اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ افراد اُس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو وطن اور قوم کے لیے کام کر رہا ہے اسی طرح اُس زمانے میں مسلم اُس عربی کو کہتے تھے جو عرب قومیت کی اس تحریک سے وابستہ تھا۔[1]

**عرب قومیت کے بارے میں بعث کا نقطۂ نظر** مائیکل عفلق لکھتا ہے:

"عرب قوم بیدار ہو رہی تھی کہ اسلام کا پیغام پہنچ گیا۔ بلکہ زیادہ صحیح لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت عربوں کے اندر جو بیداری کی رو چلی تو اسلام نے فقط اُسی بیداری کو بیان کیا ہے۔ اس لیے اسلام عرب قوم کے سوا کسی دوسری قوم میں عکس پذیر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اسلام عربوں کی خوبیوں، عربوں کے اخلاق اور عربوں کی صلاحیتوں سے عبارت ہے۔ لہٰذا اسلام یہی ہے کہ عرب طاقتور ہوں اور حکمرانی ان کے ہاتھ میں ہو۔ اسلام کی طاقت آج نئے مظہر میں وارد ہو رہی ہے اور وہ ہے عرب قومیت۔[2]"

"یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہم نماز بھی پڑھیں اور روزے بھی رکھیں۔ لیکن ہم اللہ پر ایمان رکھیں۔ ہمارا اسلام موروثی یا تقلیدی نہیں ہے بلکہ ترقی پسند ہے۔[3]"

عرب تحریک کی تاریخ بیان کرتے ہوئے عفلق لکھتا ہے:

---

[1] "فی سبیل البعث" ص ۴۵ و ۴۶ [2] ایضاً ص ۴۷ و ۴۸

[3] ایضاً ص ۵۲۔

"عرب قوم نے متعدد اوقات میں مختلف طریقوں سے اپنی زندگی اور ذات کا اظہار کیا ہے کبھی حمورابی کے قانون کی شکل میں، کبھی جاہلی شاعری کے رنگ میں، کبھی دین محمد کے اندر، کبھی عہد مامون کے کلچر میں۔ ان تمام شکلوں میں احساس اور شعور ایک ہی رہا ہے اگرچہ زمانے مختلف رہے ہیں۔ عرب قوم کی حالیہ بیداری اور ترقی آج ہی کی پیداوار نہیں ہے بلکہ اس کے رشتے ہزارہا سال پہلے کی تاریخ سے وابستہ ہیں"

"بعث کا نظریہ کبھی کبھی ماضی کا قصہ بھی چھیڑ دیتا ہے لیکن اُسے ماضی میں کوئی کمال نظر نہیں آتا ماضی ایک مرحلہ تھا جو واپس نہیں آسکتا اور نہ لایا جاسکتا ہے۔ بعث پارٹی کسی مخصوص نظریے کی علمبردار نہیں ہے نہ کسی مصنوعی خیال کو قبول کرنے کے لیے تیار ہے"[1]

"عرب قوم آج وسیع تہذیبی میراث کی مالک ہے۔ اس میراث میں کئی تہذیبیں شامل ہو چکی ہیں اور باہم اثر انداز ہو چکی ہیں مصری تہذیب، آشوری تہذیب، فینقی تہذیب سب اس میں شامل ہیں۔ جب ہم عرب قومیت کا نام لیتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم فراعنہ کی تہذیب اور میراث کا انکار کرتے ہیں یا اس سے برأت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ سطحی انداز فکر ہے۔ عرب قومیت کسی بھی انسانی تہذیب سے الگ چیز نہیں بلکہ تمام تہذیبوں کا مرکب ہے"[2]

**عفلق کی نظر میں دین کی حقیقت** | دین کے بارے میں عفلق کے خیالات ملاحظہ ہوں:

"مشکل یہ ہے کہ دین کی حقیقت اور دین کے ظاہر میں فرق ہے۔ اس لیے کہ دین کا ایک باطن ہوتا ہے اور ایک ظاہر۔ اور بعض اوقات یہ فرق باطن اور ظاہر میں تناقض کی حد تک پہنچ جاتا ہے"[3]

**اسرائیل کے متعلق اس کا نقطۂ نظر** | اسرائیل کے بارے میں عفلق کہتا ہے: "اسرائیل کا وجود ایک نفس الامری حقیقت ہے ہمیں اس امر کا پورا پورا لحاظ رکھنا چاہیے۔ فنی قابلیت کے لحاظ سے اسرائیل ترقی یافتہ ریاست ہے۔ اس کے مقابلے میں عرب معاشرہ پسماندہ ہے اور اس پر رجعت پسندوں کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ اس چیز نے اسرائیل کو اس علاقے کی ترقی یافتہ ترین ریاست بنا دیا ہے چنانچہ وہ اب مشرق کے اندر مغرب کی تہذیب کا نیا تجربہ کر رہا ہے۔ یہ تجربہ حوصلہ افزائی اور تحفظ کا مستحق ہے"[4] (باقی)

---

[1] ایضاً ۱۸۰، [2] ایضاً ۲۱۳ [3] ایضاً ص ۲۰۰۔ عفلق کا یہ نظریہ بعینہ وہی نظریہ ہے جو باطنیہ نے اختیار کیا تھا۔ قرامطہ اور حسن بن صباح کے پیرو اسی نظریے کے علمبردار تھے۔ [4] ایضاً ص ۲۲۷

# اسلامی قانونِ تعزیرات

## حدودِ شرعیہ

از: ڈاکٹر عبد العزیز عامر

(ترجمہ: معروف شاہ شیرازی)

(۳)

باغیوں کے خلاف جنگ اور مشرکین اور مرتدوں کے خلاف جنگ میں متعدد حیثیتوں سے فرق ہے، جن میں سے اہم تر یہ ہیں:

۱۔ باغیوں کے خلاف کسی اقدام سے قبل ان کو متنبہ کرنا اور راہ راست پر آنے کا موقع دینا ضروری ہے۔ ان پر اچانک حملہ کر دینا جائز نہیں۔ اور ان سے لڑنے کا مقصد بھی صرف یہ ہوگا کہ وہ بغاوت سے باز آجائیں۔ ان کا قتل بجائے خود مقصود نہ ہوگا۔ لیکن مرتدوں اور مشرکین کے خلاف جنگ میں یہ پابندیاں ضروری نہیں ہیں۔

۲۔ ان کے ساتھ جنگ اس وقت تک کی جائے گی جب تک وہ لڑتے رہیں۔ اگر وہ بھاگ نکلیں تو بھاگتے ہوؤں کا پیچھا کر کے ان کو مارنا درست نہ ہوگا۔

۳۔ ان کے زخمیوں پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے گا جبکہ مشرکین اور مرتدوں کے زخمیوں پر حملہ کرنا جائز ہے۔ جنگ جمل کے دن حضرت علیؓ نے اپنے منادی کو یہ اعلان کرنے کا حکم دیا "کسی بھاگنے والے کا پیچھا نہ کیا جائے اور کسی زخمی پر حملہ نہ کیا جائے"۔

۴۔ جنگ میں جو باغی گرفتار ہو جائیں ان کو قتل نہ کیا جائے گا جبکہ مشرکین اور مرتدوں کو قتل کیا جا سکتا ہے۔ جو باغی قید میں ہوں ان کے بارے میں اگر یہ اطمینان ہو جائے کہ وہ دوبارہ

جنگ میں شریک نہ ہوں گے تو انہیں رہا کر دیا جائے گا۔ البتہ اگر اس کے برعکس صورت ہو تو انہیں قید میں رکھا جائے گا یہاں تک کہ باغیوں کے ساتھ جنگ ختم ہو جائے۔ اس کے بعد انہیں رہا کر دیا جائے گا اور جنگ ختم ہو جانے کے بعد بھی انہیں قید میں رکھنا مناسب نہ ہوگا۔[۵۱]

بھاگنے والے باغیوں کا پیچھا نہ کرنے اور ان کے زخمیوں پر حملہ نہ کرنے، اور ان کے قیدیوں کو قتل نہ کرنے کا مسلک اکثر فقہاء نے اختیار کیا ہے جن میں امام شافعیؒ اور احمد شامل ہیں۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ قدرے فرق کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر باغیوں کا کوئی ایسا گروہ موجود نہ ہو جن سے یہ لوگ جا کر مل سکتے ہوں تو ان کا حکم یہی ہوگا۔ لیکن اگر ان کا کوئی ایسا جتھا ہو جس سے یہ لوگ جا کر مل سکتے ہوں تو اس صورت میں پیچھا کرنا، پکڑے جانے والوں کو مار دینا اور زخمیوں پر حملہ کرنا جائز ہوگا، کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو یہ لوگ اپنے جتھے سے جا ملیں گے اور اہل عدل مسلمانوں کے خلاف ازسرنو جنگ برپا کر دیں گے۔ مزید براں امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر ان کا کوئی ایسا جتھہ نہ ہو تو انہیں خوب مارا پیٹا جائے اور قید کیا جائے یہاں تک کہ وہ بغاوت سے تائب ہو جائیں۔

پہلے فریق کا استدلال اُن روایات سے ہے جو حضرت علیؓ سے جنگِ جمل کے سلسلے میں منقول ہیں۔ اُن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ نیز وہ لوگ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا "ام عبد کے بیٹے! میری امت کے خلاف جو شخص بغاوت کرے اُس کا حکم کیا ہے؟" حضرت عبداللہ نے عرض کیا "اللہ اور اللہ کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔" اس پر حضورؐ نے فرمایا "ان کے بھاگنے والے کا پیچھا نہ کیا جائے، ان کے زخمی پر حملہ نہ کیا جائے، ان کے قیدی کو قتل نہ کیا جائے، اور ان کا مال غنیمت کے طور پر تقسیم نہ کیا جائے۔" علاوہ بریں ان کا استدلال یہ ہے کہ باغیوں کے خلاف جنگ کرنے کی اصل غرض و غایت تو ان کو امام کے خلاف سرکشی سے روکنا ہے اور یہ مقصد ان کی ہزیمت سے حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ان کو قتل

---

۵۱۔ الاحکام السلطانیہ، الماوردی ص ۵۶ اور اس کے بعد۔ الاحکام السلطانیہ، ابویعلی ص ۳۹

کرنا جائز نہ ہوگا جیسا کہ حملہ آور کا حکم ہے[1]۔

میرے خیال میں جو فقہاء بھاگنے والوں کا پیچھا نہ کرنے اور ان کے مجروحین پر حملہ نہ کرنے کے قائل ہیں ان کی رائے زیادہ قابلِ قبول ہے۔ ایک تو ان دلائل کی بنا پر، جو اس رائے کے قائلین پیش کرتے ہیں، اور دوسرے اس لیے کہ باغیوں کی شکست کے بعد انہیں قتل کرنا غیر ضروری سختی ہے اور شریعت اسلامیہ کی روح اس سے انکار کرتی ہے تاہم اگر شکست خوردہ باغیوں کے معاملہ میں مزید احتیاط کی ضرورت ہی ہو تو قتل کے سوا تعزیر کی دوسری صورتوں کے لیے دروازہ بہر حال کھلا ہوا ہے۔ اصل چیز تو مصلحت ہے اگر مصلحت کا تقاضا یہ ہو کہ باغیوں کو سزا دی جائے تو ایسا کرنا جائز ہے۔

۵۔ باغیوں اور مشرکین و مرتدین کے احکام میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ باغیوں کے اموال کو مالِ غنیمت نہ قرار دیا جائے گا اور نہ ان کی اولاد کو غلام بنایا جائے گا کیونکہ حدیث میں ہے "دارالاسلام ہر اس چیز کی حفاظت کرتا ہے جو اس کے اندر ہے اور دارالشرک ہر اس چیز کو مباح کرتا ہے جو اس کے اندر ہے[2]"۔

ایک اور فرق یہ ہے کہ باغیوں سے جنگ کرتے ہوئے ان پر گولہ باری نہیں کی جا سکتی، نہ ان کے گھر جلائے جا سکتے ہیں، اور نہ ان کے درخت کاٹے جا سکتے ہیں، کیونکہ جنگ دارالاسلام میں ہو رہی ہوتی ہے اور دارالاسلام اپنی تمام چیزوں کے ساتھ مامون ہے۔ ہاں اگر باغی اہلِ عدل کو گھیر لیں اور ان سے سخت ٹکراؤ کا خطرہ ہو تو اس صورت میں اہلِ عدل کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ جس طرح ہو سکے اپنا دفاع کریں۔ اس حالت میں ان کے لیے باغیوں کو قتل کرنا اور ان پر گولہ باری کرنا جائز ہوگا۔ کیونکہ ایک مسلمان کے لیے اپنی جان کی حفاظت کے لیے قتل کا ارتکاب کرنا جائز ہے جبکہ اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہ رہے[3]۔

اوپر کی بحث سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ باغیوں کے معاملہ میں مختلف حالات کے لحاظ سے احکام مختلف ہیں۔ بعض حالات میں امام کے لیے یہ جائز ہے کہ ان کو قتل کے سوا دوسری سزائیں دے، مثلاً

---

[1] معین الحکام ص ۱۸۵۔ الشرح الکبیر ج ۱ ص ۵۸ اور اس کے بعد۔

[2] الاحکام السلطانیہ، الماوردی ص ۵۷۔ الاحکام السلطانیہ، ابو یعلیٰ ص ۳۹۔

[3] الاحکام السلطانیہ، ابو یعلیٰ ص ۴۰